بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی اشاعت میں ایک مدت سے جو بے قاعدگی چلی آرہی ہے اس کی وجہ سے ناظرین کو سخت شکایت ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح رسالہ کی اشاعت اپنے وقت پر ہونے لگے، اور اسی غرض کے لیے متعدد مرتبہ کئی کئی مہینوں کے پرچے ملا کر یکجا شائع کیے مگر اس کے باوجود اشاعت کا نظام درست کرنے میں مجھے ناکامی ہوئی۔ اب اس خرابی کا کوئی علاج اس کے سوا نظر نہیں آتا کہ جمادی الاولیٰ جمادی الآخرہ اور رجب کی اشاعت منسوخ کرکے شعبان کا پرچہ شعبان ہی میں شائع کر دیا جائے اور منسوخ شدہ مہینوں کے عوض تمام خریداروں کی مدتِ اشاعت میں ۳ مہینہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق اب یہ شعبان کا پرچہ شائع ہو رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آئندہ کے لیے رسالہ کی اشاعت کا نظام درست رہے۔

پریس اور کاغذ کے لیے ہم نے اپنے ہمدردوں سے اعانت کی درخواست کی تھی اس کے جواب میں ۵ ستمبر تک جو رقمیں وصول ہوئی ہیں ان کی مجموعی مقدار دو ہزار سات سو چھبیس روپے ہے۔ اس میں سے ۱۶۲ روپے بطور اعانت آئے ہیں اور ۱۰ سو روپے بطور قرض۔ پریس خرید لیا گیا ہے اور یہاں لا کر نصب کیا جا چکا ہے۔ اب صرف بجلی کی امداد اور ڈیکلریشن کی منظوری کا انتظار ہے۔ یہ دو مرحلے طے ہونے کے بعد ان شاء اللہ ہماری مطبوعات خود اپنے پریس میں طبع ہونے لگیں گی۔ اب دوسری اہم ضرورت کاغذ کے ذخیرہ کی فراہمی ہے جس کے لیے ہم پوری جدوجہد کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں بھی ہم کو مزید اعانت کی ضرورت ہے۔

ربیع الآخر کی اشاعت میں جس درسگاہ کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا اس کے لیے ابھی ابتدائی انتظامات بھی پوری

طرح نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی صرف تجویز کا اظہار کیا ہے، قیام کا اعلان نہیں کیا ہے۔ لہٰذا کوئی صاحب اس غلط فہمی کی بنا پر اپنے بچے یہاں نہ بھیج دیں کہ باقاعدہ کام شروع ہو چکا ہے جن حضرات کا ارادہ اپنے بچے یہاں بھیجنے کا ہو وہ سر دست ہم کو صرف اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیں اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیں کہ بچہ کی عمر کیا ہے، اس کی اب تک کی تعلیم کس نوعیت کی اور کس حد تک ہوئی ہے، اور وہ اس کے تعلیمی خرچ کا کس قدر بار اٹھا سکتے ہیں جب ہم اپنے انتظامات مکمل کر لیں گے تو ان کو اطلاع دے دیں گے۔

نئے مرکز کی تاسیس اور جماعت کے آئندہ کام کے سلسلہ میں اس وقت چند ایسے اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے جماعت کی مجلسِ شوریٰ کا انعقاد ناگزیر ہو گیا ہے اگرچہ ان مسائل کی نوعیت تو اس کی مقتضی تھی کہ اجتماع عام کی دعوت دی جائے لیکن ملک کے موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے، لہٰذا مجبوراً یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ شوال کے دوسرے ہفتہ میں صرف اصحابِ شوریٰ کو مجتمع کر کے ان امور کا تصفیہ کر لیا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اس مشورہ میں ہم کو ایسے فیصلے کرنے پڑیں جن کا جماعت کے نظام اور اس تحریک کے مستقبل پر غیر معمولی اثر مترتب ہو، لہٰذا میں رفقائے جماعت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اصحابِ شوریٰ کے خلوص اور ان کی اصابتِ رائے پر پوری طرح اعتماد کریں اور اطمینان رکھیں کہ اس مقصدِ عظیم کی خدمت کے لیے بہتر سے بہتر ممکن صورت اختیار کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ شوریٰ کے لیے ۸ر شوال مقرر کی گئی ہے اور ارکانِ شوریٰ کی سہولت کے لیے مقامِ اجتماع دہلی تجویز ہوا ہے۔

"تفہیم القرآن" میں آیت وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (رکوع ۲۴) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ "باز آجانے سے مراد کفار کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہی کافر، مشرک، دہریے، ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے رکھے اور جس کی چاہے عبادت کرے یا کسی کی نہ کرے اس گمراہی سے اس کو نکالنے کے لیے ہم اسے فہمائش اور نصیحت کریں گے مگر اس سے لڑیں گے نہیں لیکن اسے یہ حق ہرگز

نہیں ہو کہ خدا کی زمین پر خدا کے قانون کے بجائے اپنے باطل قوانین جاری کرے اور خدا کے بندوں کو غیر از خدا کسی کا بندہ بنائے یہ فتنہ بزورِ شمشیر مٹایا جائے گا اور مومن کی تلوار اس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک کفار اپنی اس روش سے باز نہ آجائیں"۔ اس تفسیر کے خط کشیدہ فقرے پر ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب علم بزرگ نے حسب ذیل اعتراض کیا ہے

"(ا) اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام جو امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، دوسروں کے مذہب میں مداخلت اور اس بنا پر لڑائی روا رکھتا ہے حالانکہ یہ امر لا اکراہ فی الدین کے مخالف ہے۔

(ب) مخالفین کو اپنے اپنے مذہب اور عقائد پر قائم رہنے کی آزادی لکم دینکم ولی دین سے بھی ظاہر ہے۔ جو کوئی اپنے عقائد میں آزاد ہوگا اسے ان کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی آزادی ہونی چاہیے کیونکہ وہ انہی عقائد کو برحق سمجھتا ہے۔ قرآنی مفہوم سے اسی آزادی کا پتہ چلتا ہے اور باہمی مناظرات کا ثبوت بھی ملتا ہے، مثلاً لَا تُجَادِلُوْٓا اَھْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ غیر مذاہب کے عبادت خانے اور طریق عبادت اسلامی مداخلت سے محفوظ رہے ہیں حتیٰ کہ مسجد نبوی میں اہل کتاب کو اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی ملازمت اختیار کی جس کا عقیدہ اور عمل مشرکانہ تھا، وہاں اپنے طور پر امن کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے جیسا کہ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ سے ظاہر ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے خیالات و عقائد کی اشاعت کا حق پہنچتا ہے۔

(ج) زیر خط عبارت کو مد نظر رکھتے ہوئے مسلمان کہیں بھی مخلوط آبادی میں امن سے زندگی نہیں گزار سکتے۔ غیر مسلم تمدنی اور معاشرتی امور میں بھی کیوں ان کے ساتھ تعاون باہمی اور رواداری سے کام لیں جب کہ ان کا سیاسی اور اساسی عقیدہ ہی ستیزہ ہو؟ ایسے مسلمان گر ترکی اور ایران میں بھی آباد ہوں تو بقول آپ کے وہاں بھی انہیں عَلَمِ جہاد بلند کرنا ہوگا کیونکہ ان ممالک میں حدود اور قوانین اسلامی نافذ نہیں۔ اس زمانہ میں عالمگیر سیاست اس نہج پہ مدون ہے کہ کوئی جماعت غیر معروف طریق

سے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل باہمی سے کام نہیں لے سکتی کیونکہ آپ کا فرمودہ استدلال کسی اشتراک عمل کے لیے مانع ہو گا۔ اگر اسلامی جماعت اپنے عقائد کی اشاعت کا حق رکھتی ہے تو اسے غیر مسلموں کو بھی، خصوصاً جب کہ وہ حکمراں ہوں وہی حق دینا ہو گا۔ ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند رسول اکرم صلعم نے مدینہ منورہ کے اہل کتاب کے ساتھ جو تعامل باہمی کے معاہدے کیے تھے کیا وہ معاہدے ایسی شرائط پر مبنی تھے؟ مکی زندگی کے ابتدائی مراحل آپ کے استدلال کے مؤید نہیں۔ بالفاظ دیگر ایسی جماعت کا وجود ہی کسی غیر مسلم حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہے کہ جونہی اسے قوت ملی وہ اس کے قوانین اور اس کے نظام حکومت کو مٹانے کے لیے تلوار ہاتھ میں لے لے گی کون اس کو برداشت کرے گا؟

اس اعتراض کا مختصر جواب خط کے ذریعہ سے دیا جاسکتا تھا لیکن یہ اعتراض جس طرز خیال کی ترجمانی کر رہا ہے وہ آج کل عام طور پر پھیلا ہوا ہے، اور قریب قریب ہر جگہ وہی دلائل اس طرز خیال کی تائید میں ہرائے جاتے ہیں جو صاحب معترض نے تحریر فرمائے ہیں اس لیے یہاں اسے نقل کر کے جواب دیا جا رہا ہے۔

یہ بحث تو بعد میں ہوتی رہے گی کہ اسلام امن اور سلامتی کا مؤید کس معنی میں ہے اور لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبوت کرنے آئے تھے یا تلاش روزگار میں نکلے تھے۔ ان سب باتوں سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا چاہیے کہ فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا۔ کیا وہ جباروں کی سواری کے لیے انسانوں کو سدھانے آیا ہے تاکہ ہر جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اٹھے تو اسلام کے پیروؤں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لیے پُرامن رعیت فراہم کرنے کا اجارہ لیا ہے کہ ہر حکومت کو اپنی مشینری چلانے کے لیے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ڈھلے ڈھلائے پرزے حاصل ہو جایا کریں، قطع نظر اس سے کہ حکومت کا نظام کچھ ہو؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اصول اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی لچک اور اتنی نرمی پیدا کر دے کہ وہ ہر نظامِ تمدن میں بآسانی کھپ سکیں بلالحاظ اس کے کہ اس نظام کی نوعیت کیسی ہی ہو؟

اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام بودھ مذہب اور سینٹ پال کی بنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے مذہب کی کتاب میں قاتلوہم جیسا خوفناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں۔ اسے تو اپنے پیروؤں کو جنگ اور جہاد کا حکم دینے کے بجائے اپنے مخالفین سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ہم غریبوں کو آخر کیوں مارتے ہو؟ ہم نہ نظامِ حکومت میں کوئی انقلاب کرنا چاہیں نہ نظامِ تمدن میں کسی ترمیم و تنسیخ کی دعوت دیں، اقتدار کسی کا ہو اس کے ماتحت پُرامن باشندوں کی حیثیت سے رہنا ہمارا مسلک اور حکومت وقت کی وفاداری ہمارا دین و ایمان، پھر ہم سے تمھیں پرخاش کی کیا وجہ؟ رہا ہمارا مذہبی عقیدہ اور ہمارا پوجا پاٹ کا نظام تو اس سے تمھارا کیا بگڑتا ہے، تمھارا کونسا تمدنی ادارہ اور کونسا مفاد ایسا ہے جس پر ہمارے عقیدے یا ہماری پوجا کی ضرب پڑتی ہو۔ یہ جواب اگر اچھے معقول پیرایہ میں دیا جاتا اور عملاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو وفاداری کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تو مشرکینِ مکہ ہمارے انگریز آقاؤں کے مقابلہ میں کچھ ایسے زیادہ نامعقول نہ تھے کہ مسجدوں میں اذان و نماز کی آزادی اور تبلیغی انجمنوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔

لیکن اگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظامِ زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرزِ عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں، اور اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے، اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہی نظام حق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے، تو اس کے ساتھ یہ قطعی ناگزیر ہے کہ وہ زمین میں اپنے نظام کے قیام اور دوسرے نظامات کے مٹانے کا بھی متقاضی ہو۔ کیونکہ اول تو ایک نظامِ زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عملاً اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسر ایک مہمل بات ہے اور اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ دوسرے نظامات کو باطل بھی کہا جائے اور ان کے وجود کو برداشت بھی کیا جائے۔ دوسرے یہ بات بداہتہً محال ہے کہ ایک نظامِ زندگی کی

پیروی کسی دوسرے نظامِ زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جا سکے اس لیے وہ صرف ایک فاترالعقل ہی ہو سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی پیروی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظامات کے اندر پُرامن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔ پس اسلام کا ایک نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو مٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے، اور اس مقصد کے لیے اپنے پیرووں کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے، اور مدعیانِ اتباع کے ایمان وعدمِ ایمان کا نشانِ امتیاز اسی کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظامات کے ماتحت جینے پر راضی رہتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو صاف نظر آجائے گا ــــ بشرطیکہ دل میں کوئی چور نہ ہو ــــ کہ اسلام نے یہی دوسری پوزیشن اختیار کی ہے نہ کہ پہلی۔

جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی اس حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہونا چاہیے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے، غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل ہو سکے یا نہ ہو سکے، بہر حال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانونِ شرعی نافذ نہیں ہے وہاں اس کے نفاذ کے لیے عَلَمِ جہاد بلند کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ اسے برداشت بھی کریں، اور نہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل ہمارے لیے اس قدر قیمتی ہے کہ جس نظامِ زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و تعامل اس صورت میں نہ ہو سکے گا۔ اسلام بے شک امن اور سلامتی کا حامی اور مؤید ہے، مگر اس کی نگاہ میں امن اور سلامتی

وہی ہے جو حدود اللہ کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظامات کے زیر سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹے اس نے اسلام کا نقطۂ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور ایسی سلامتی کا ہرگز حامی اور مؤید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا لااکراہ فی الدین، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منواتا کیونکہ یہ منوانے کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی، جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے، زبردستی کسی پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ ایمانِ صحیح کے بغیر وہ بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں امور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ قوانینِ تمدن جن پر اسٹیٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں اور خدا کے باغی اُن کو نافذ کریں۔ اس معاملہ میں بہر حال ایک فریق کو دوسرے فریق کے مذہب میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی تو بجائے اس کے کہ کافر اہلِ ایمان کے مذہب میں مداخلت کریں، زیادہ بہتر یہ ہے کہ اہلِ ایمان اُن کے مذہب میں مداخلت کریں۔ نہ کریں گے تو خدائی مذہب کا ایک بڑا حصہ معطل ہو جائے گا اور اہلِ ایمان کی زندگی کے ایک بڑے حصہ پر کفار کا مذہب مسلط ہو گا۔